© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

گزشتہ ماہ کے وسط میں صدر مملکت نے ایک غیر ملکی مصنفہ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا "جس چیز سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں وہ قرآن حکیم کا تبحر اور اس کی عظمت ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس اور اُن کی زندگی کلامِ پاک میں ارشادات خداوندی کے اتباع کا عملی نمونہ تھی اور وہ خاتم المرسلین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ ہی کو اپنے ایمان کا سرچشمہ سمجھتے ہیں"۔ صدر محترم کے بیان کا یہ حصّہ بڑا ایمان افروز ہے اور اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ انہیں اسلام اور حضور سرورِ دو عالم سے گہری محبت ہے۔ ہم اپنے ایک مسلمان بھائی کے بارے میں حُسنِ ظن رکھتے ہیں اور اُن کی تصریحات کو محض الفاظ کی صنّاعی نہیں سمجھتے بلکہ ان کے قلبی احساسات کی ترجمانی خیال کرتے ہیں۔ لیکن ایک سیدھے سادے مسلمان کی طرح اسلام کے ساتھ آجکل جو بیت رہی ہے جب ایک طرف اُس کو نگاہ میں رکھتے ہیں اور دوسری طرف صدر محترم کے ان خیالات کو سامنے لاتے ہیں تو عجیب سی اُلجھن اور وحشت محسوس ہوتی ہے۔

ہمارے لیے یہ تسلیم کرنا بھی مشکل ہے کہ جنابِ صدر اس ملک میں بے بس ہیں۔ اور وہ ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو ایمان کا حقیقی سرچشمہ سمجھتے ہوئے، اُسے اپنے لیے اور قوم کے لیے مشعلِ راہ بنانا چاہتے ہیں مگر اسلام کے دشمن اُن کی چلنے نہیں دیتے۔ ہم گذشتہ دس برس سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ اس ملک کے سیاہ و سپید کے مالک ہیں اور جس شخص سے جو معاملہ چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں اور جن افکار و نظریات کو یہاں رواج دینا چاہتے ہیں، عوام کے منشا کے علی الرغم دے دیتے ہیں۔ اس بنا پر اسلام کے معاملے میں اُن کی بے بسی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ پھر ہماری عقل یہ بھی باور نہیں کر سکتی کہ وہ تو اسلام کو نافذ کرنے کے آرزومند ہیں مگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوم ملحدانہ افکار اور غیر اسلامی اقدار کو رواج دینے پر ادھار کھائے بیٹھی ہے اور صدر مملکت کو اسلامی نظام کے قیام میں اس لیے تامل ہو رہا ہے کہ اگر انہوں نے اسے قوت کے زور سے نافذ کر دیا تو قوم شدید مزاحمت کرے گی، اور اس طرح وہ باہمی کشمکش کا شکار ہو کر برباد ہو جائے گی۔ ہم قوم کے احساسات کا جہاں تک اندازہ کر سکے ہیں اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ایک نہایت ہی قلیل طبقے کے سوا پوری قوم اس ایک بات پر آج بھی متحد و متفق ہے کہ یہ ملک جس مقدس مقصد کے لیے حاصل کیا گیا ہے اس مقصد کو جلد سے جلد پورا کیا جائے کیونکہ اس ملک کی بقا اور فلاح کا راز صرف اسلام کی سچی پیروی میں مضمر ہے۔ قوم کے اس احساس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں بلکہ اُس ردّعمل سے اس کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو اسلام کے مطابق کام کرنے اور اُس کے خلاف کرنے سے اس قوم کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ بیس سال کی مدت کوئی ایسی طویل مدت نہیں جس کا احاطہ نہ کیا جا سکتا ہو۔ اسے سامنے رکھیے اور دیکھیے کہ اسلام کی پکار پر اس قوم نے کس جوش اور کس ولولے کے ساتھ لبیک کہا اور پھر اس کے لیے کس بے مثال ایثار کا ثبوت دیا اور اس کے خلاف کسی غیر اسلامی نظریے کی دعوت اور کسی جاہلیت کے نعرہ کو کس شدید اضطراب کے ساتھ سنا اور کس شدید کرب کے ساتھ برداشت کیا۔ لہٰذا یہ بات کہ قوم اسلام کو اپنانے پر آمادہ نہیں اور صدر مملکت قومی مصالح کے تحت اسے اُس پر ٹھونسنا نہیں چاہتے اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتی۔

خدا کو لوگوں نے دیکھا نہیں بلکہ اُس کی قدرت سے اُس کو پہچانا ہے۔ اسی طرح محبت و عقیدت گو ایک غیر مرئی جذبہ ہے لیکن یہ اپنے اظہار کے لیے محسوس راستے ہی اختیار کرتا ہے۔ جو فرد یا قوم جن افکار و نظریات سے محبت کرتی اور جن شخصیتوں کی عقیدت کا دم بھرتی ہے اُس کے فکر و نگاہ کے زاویوں میں، اُس کے پسند و ناپسند کے معیارات میں اور اس کے طرزِ عمل میں ان افکار و نظریات کی نسبت سے بعض نمایاں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے مؤثر تبدیلی یہ ہے کہ وہ فرد یا قوم اپنے پسندیدہ اور محبوب تصورات کے مقابلے میں کسی دوسرے تصور کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتی بلکہ جو افکار اس کی ضد ہوتے ہیں انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ قوم اپنے پسندیدہ نظریات کو نہ صرف دل و جان سے اپناتی ہے بلکہ اُن کی سربلندی کے لیے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی دریغ نہیں کرتی۔ محبت کوئی بے حس اور بے کیف جذبہ نہیں جو سینے کے کسی اُجڑے ہوئے گوشے میں یونہی نیم مُردہ حالت میں پڑا رہے۔ یہ بڑا متحرک اور مؤثر جذبہ ہے جو انسان کی پوری زندگی میں انقلاب برپا کرتا ہے، بے حسی اور محبت دو متضاد کیفیات ہیں جو کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ انسان کو جس نسبت سے کسی چیز یا نظریے سے محبت ہوگی اسی تناسب سے اُس کے اندر یہ احساس پیدا ہوگا کہ وہ اپنی محبوب شئے یا نظریہ کو دنیا کی ہر دوسری شئے یا نظریے پر غالب دیکھے اور جو اشیاء یا نظریات اس کی ضد ہیں انہیں یا تو مٹا دے یا اس کے مقابلے میں بالکل بے وزن کر کے رکھ دے۔ محبّت کے جذبے کے اندر غیرت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے، اس جذبے میں سرشار انسان اس بات کو کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی دوسرا تصور اس کے محبوب تصور کے مقابلے میں اُبھر سکے۔ پھر یہ جذبہ بڑا حسّاس بھی ہوتا ہے۔ جونہی کوئی معمولی سی جنبش اس کے خلاف پیدا ہوتی ہے تو یہ فوراً انسان کو مضطرب کر دیتا ہے اور اس وقت تک اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا جب تک کہ حالات معمول پر نہ آجائیں اور خطرہ پوری طرح ٹل نہ جائے۔

مسلمانوں کے اس دَورِ انحطاط میں یوں تو عوام کے اندر بھی بالعموم اسلام کے ساتھ سچی محبت اور عملی وابستگی کم ہوتی جارہی ہے ورنہ وہ غیر اسلامی افکار و عادات کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے اندر گوارا نہ کرتے۔ لیکن اس بارے میں برسرِ اقتدار طبقوں کی بے حسی تو حد درجہ تشویشناک ہے۔ صدر محترم نے اسلام سے گہرے تعلقِ خاطر کا اظہار فرمایا ہے۔ مگر ہم بصد احترام مگر بڑے رنج اور افسوس کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اسلام کے معاملے میں انہوں نے اور اُن کی حکومت نے جو طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے اُس سے دینی احساس و شعور رکھنے والے عوام و خواص میں سخت بے اطمینانی اور بے چینی پھیل رہی ہے۔ چنانچہ ہم ان صفحات کے ذریعے ان کی توجہ چند اُمور کی طرف دلانا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اسلام کی محبت کی خاطر وہ اس پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی کتاب "اسلام" پر پورے ملک میں جو اضطراب پیدا ہوا ہے اس کے وجوہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے صدرِ مملکت اور اُن کی حکومت ناواقف نہیں۔ انہیں اس بات کا علم ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اسلامی معتقدات سے ہم آہنگ نہیں چنانچہ ان کی حکومت نے اچھا کیا کہ اس شخص سے گلو خلاصی حاصل کی اور عوام کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو ایک حد تک بروقت فرو کر دیا۔ مگر اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے انسان کے ذہن میں فطری طور پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہاں مسندِ اقتدار پر غیر مسلم متمکن ہوتے تو مسلم عوام کو دینی معاملات میں یہی روش اختیار کرنا چاہیے تھی یعنی جب کوئی خلافِ دین بات اُن کے سامنے آتی تو وہ علانیہ طور پر غم و غصہ کا اظہار کرتے اور حکومت کو بتاتے کہ فلاں فلاں معاملے میں اُن کے مذہبی احساس کو ٹھیس پہنچی ہے اس لیے اس کے تدارک کی فکر کی جائے لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ یہاں خدا کے فضل سے زمامِ کار اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں جنہیں اسلام سے گہری محبت اور عقیدت ہے جنہیں اسوۂ رسولؐ سے والہانہ عشق کا دعویٰ ہے اور جو اس اسوۂ حسنہ کے اتباع ہی میں نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ پوری نوعِ بشری کی فلاح و کامرانی کا راز پاتے ہیں۔ اسلام کے ساتھ اس درجہ وابستگی کے ہوتے ہوئے کسی فتنے کے تدارک کے لیے عوام کی طرف سے اس قدر شدید تقاضے کا منتظر رہنا یا اس تک نوبت پہنچنے دینا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ شاید صدرِ مملکت کو اس فتنے کا علم ہی نہ ہو۔ مگر یہ بات بھی قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ جس مقتدر شخصیت کا نظام جاسوسی و سراغرسانی اتنا مضبوط ہے کہ وہ ہر اُس فرد یا گروہ پر کڑی نگاہ رکھتا ہے جو صدرِ محترم سے ذرا اختلاف کی جرأت بھی کرے اور پھر اس کی بنیاد پر اُس کی حکومت ایسے افراد اور گروہوں پر عتاب بھی نازل کرتی رہتی ہے اور انہیں راہِ راست پر لانے یا بے اثر بنانے کے لیے بڑے مؤثر اقدام بھی کرتی رہتی ہے، اس کے بارے میں یہ سوچنا کہ اُسے دین کے خلاف فتنوں کا صحیح علم نہیں ہو نے پاتا بالکل ناقابلِ یقین ہے۔ صدرِ مملکت نے اپنی انتظامی مشینری کو جس سانچے میں ڈھالا ہے اُس کی استعدادِ کار میں کسی اور پہلو سے اضافہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر اس پہلو سے ضرور اضافہ ہوا ہے کہ جو لوگ ذرا بھی اُن سے مختلف انداز سے سوچتے ہیں اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے یا کم از کم انہیں ملک کے اجتماعی معاملا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بالکل بے اثر بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس مستعد مشنیری کے ہوتے ہوئے یہ قیاس کرنا کہ انہیں شاید ان فتنوں کی اطلاع نہیں ہوتی، ناقابلِ فہم ہے۔

پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب جن افکار و خیالات کے علمبردار ہیں، وہ کوئی ایسے خیالات نہیں جو دفعتہً صدر مملکت کے سامنے آئے ہوں۔ وہ اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ جس اسوۂ رسولؐ سے انہیں محبت ہے اس اُسوہ کے خلاف یہاں ایک گروہ باقاعدہ سازش کر رہا ہے۔ اور جس اُسوہ کی اتباع کو وہ اپنے لیے اور نوعِ انسانی کے لیے فلاح کا واحد راستہ سمجھتے ہیں۔ اُس کے بارے میں یہاں گزشتہ چند سال سے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت یہ تاثر قائم کیا جا رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و افعال کا جو ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے، اور جس کی وساطت سے ہم حضورؐ کا اسوۂ حسنہ معلوم کر سکتے ہیں، بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔ بلکہ یہ ایک سازش کا نتیجہ ہے۔ یہ گروہ پوری بیباکی کے ساتھ اس قسم کے باطل افکار کو مسلسل کئی برس سے پھیلا رہا ہے مگر اس گروہ کی سرگرمیوں پر کبھی ایک دفعہ بھی گرفت نہیں ہوئی بلکہ حکومت بعض حالات میں اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے۔ اس کا لٹریچر مختلف دفاتر میں بڑی آزادی کے ساتھ پہنچتا ہے اور حکومت کے بعض اونچے عہدیدار اس کی اشاعت میں کھلے بندوں حصہ لیتے ہیں۔ اور تو اور خود صدرِ محترم کے دستِ راست اور مرکزی کابینہ کے وزیر تک اس کے اجتماعات میں شریک ہو کر اس کے خیالات کی تائید کرتے ہیں اور پھر اُن کی اس تائید کو سرکاری نشرو اشاعت کے مختلف اداروں کے ذریعہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک پھیلایا جاتا ہے۔

صدر مملکت نے اپنی تقریبات میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ حضورؐ کی زندگی کلامِ پاک میں ارشاداتِ خداوندی کے اتباع کا مکمل نمونہ تھی اور وہ ایمان کا سرچشمہ ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ حضورؐ کے ارشادات اور افعال اور آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے سارے گوشوں کو آیاتِ الٰہی کی عملی تفسیر سمجھتے ہیں اور انہیں اس بات کا یقین ہے کہ حضورؐ کا ہر قول اور ہر فعل منشاءِ الٰہی کی ترجمانی کرتا ہے اور اس پر دل وجان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ایمان اور اس کی پیروی کی سچی آرزو ہی اسلام کا بنیادی اقتضا ہے۔ لیکن ان کی خدمت میں ہم پھر گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ براہ کرم یہ دیکھیں کہ یہاں عملاً کیا ہو رہا ہے۔ یہاں ایک گروہ ایسا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد نبوت کے اجرا کا قائل ہے اور فی الحقیقت ایک دوسرے شخص کو نبی مانتا ہے۔ اور اُس کی ذات، اُس کے خاندان اور اُس کے ساتھیوں کے ساتھ محبت و عقیدت کے وہی جذبات رکھتا ہے جو امتِ مسلمہ ختم المرسلین کے ساتھ رکھتی ہے۔ صدرِ مملکت جیسے صاحبِ فہم و فراست اور اقبال کے شیدائی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے کہ کسی شخص کی نبوت پر ایمان لانے کے کیا معنی ہیں اور اس کے کیا تقاضے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس ذاتِ اقدس پر آدمی ایمان لاتا ہے اُسے وہ اپنی ساری محبت اور عقیدت کا محور سمجھتا ہے اور اس بات کا پختہ یقین رکھتا ہے کہ یہ ذات جو کچھ کہہ رہی ہے یا کر رہی ہے وہی منشائے الٰہی ہے۔ اس بنا پر وہ اس ذاتِ پاک کے سارے ارشادات اور افعال کو دین میں حجت تسلیم کرتا ہے اور ان کے مقابلے میں ہر دوسرے فرد یا گروہ کی ہر بات کو باطل سمجھتا ہے۔ کیونکہ نبی کے قول و عمل اور اسوہ کا اتباع ایمان کی خشتِ اوّل ہے۔

اب اگر ایک فرد یا گروہ حضور سرورِ دو عالم کے بعد کسی دوسرے انسان کو نبی مانتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی عقیدت کا مرکز حضور سرورِ کائنات کی ذاتِ گرامی نہیں بلکہ یہ دوسرا شخص ہے جسے اُس نے بعد میں نبی تسلیم کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اس کے نزدیک فیصلہ کن اہمیت اس دوسرے شخص کو حاصل ہے اور اس کی باتوں کو وہ دین میں حجت سمجھتا ہے اور ان کے اتباع کو ہی اپنے ایمان کا اقتضا قرار دیتا ہے۔ اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ انسان اصل اہمیت اُس نبی کی تعلیمات کو دیتا ہے جسے وہ اپنے زمانے سے قریب تر پاتا ہے۔ چنانچہ اس ملک میں جو لوگ حضور ختم الرسلؐ کے بعد کسی دوسری نبوت کے قائل ہیں ان کی زندگی کا انداز امتِ مسلمہ سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں تک کہ جو باتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کے لیے عین تقاضائے ایمان ہیں، ان کے نزدیک وہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ بعض کو تو انہوں نے حرام قرار دیا ہے۔ ان لوگوں کا پورا نظام اس نئی نبوت، اس کے مزعومات، اور اس کے خاندان کے گرد گھومتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضور نبی آخر الزمان کی نبوت پر ایمان رکھنے والے اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ سے محبت کے دعویدار سے آخر اس بات کی کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ نبوت کے ان واضح مقتضیات و مسائل کو نہ سمجھتا ہوگا اور اس کی نگاہ سے یہ باتیں اوجھل ہونگی۔ ممکن ہے یہاں کوئی صاحب یہ کہیں کہ پاکستان میں ہر اُس شخص کو عزت کے ساتھ جینے کا حق ہے جو قانون کا احترام کرتا ہے۔ ہم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور اسے ایک جائز اور معقول موقف سمجھتے ہیں۔ البتہ یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس حق کا مطلب آخر یہ کیوں فرض کر لیا گیا کہ اس گروہ کے افراد کو کلیدی مناصب سونپ دیئے جائیں۔ اور وہ اندرونِ ملک و بیرونِ ملک جو چاہیں کرتے پھریں۔ ممکن ہے کہ اس گروہ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ایک مخصوص بلاک سے ہمیں چند مادی مراعات اور قرضے بھی حاصل ہو سکیں اور اندرونِ ملک بھی اس کی خوشامدانہ روش کی وجہ سے اقتدار کے جذبۂ خوشامد پسندی کی تسکین بھی ہو جاتی ہو۔ لیکن سوچنا چاہیے کہ اندرونِ ملک اس گروہ کا بڑھتا ہوا عمل دخل حضور سرورِ کائنات کے اسوہ حسنہ کے مرتبہ و مقام پر کیا اثر ڈالے گا۔ حضورؐ کا اُسوۂ حسنہ صرف نماز روزے تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں ہمیں زندگی کے سارے گوشوں کے لیے واضح ہدایات ملتی ہیں۔ اس اسوہ سے جہاں ہمیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اوراد و وظائف کے متعلق رہنمائی حاصل ہوتی ہے وہاں ہمیں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ حضور سرورِ دو عالم نے اجتماعی امور کے بارے میں ہمیں کیا تعلیم دی ہے۔ مسلمان قوم کو دشمن کے ساتھ نمٹنے کے لیے کیا اصول عطا فرمائے ہیں، استعماری طاقتوں کے معاملے میں کونسی روش اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ کیا اس گروہ کے تسلط کے بعد، جو مذہب اور سیاست کی تفریق کا علمبردار ہے، حکومت کے لیے ممکن ہے کہ وہ حضور سرورِ کائنات کے اسوۂ حسنہ کو زندگی کے اجتماعی معاملات میں بھی اپنا رہنما بنا سکے؟

صاحبِ صدر کی تصریحات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ قرآن کی ساری تعلیمات کو اور حضور سرورِ کائنات کے ارشادات کو قیامت تک کے لیے دین میں حجت سمجھتے ہیں اور اس میں کسی تغیر و تبدل یا تنسیخ و ترمیم کے قائل نہیں۔ وہ جب یہ بات مانتے ہیں کہ قرآن خدا کا آخری پیغام ہے اور حضورؐ خدا کے آخری نبی ہیں اور انہوں نے زندگی میں جو کچھ فرمایا یا کیا وہ خدا کے منشا کا اظہار تھا تو اس سے یہ حقیقت خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتاب وسنّت کے اندر جو کچھ موجود ہے وہ قیامت تک واجب الاتباع ہے اور کوئی فرد، یا گروہ یا ادارہ یا پوری نوعِ بشری مل کر بھی اس میں اپنی مرضی سے کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ صدر مملکت کا کتابِ الٰہی اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق یہ موقف بالکل درست ہے، کیونکہ فرامینِ الٰہی اور احکامِ رسولؐ کے اندر کوئی شخص کسی ترمیم کا تصور نہیں کر سکتا۔ لیکن اس ملک میں ان ناقابلِ تغیر تعلیمات کے بارے میں جو گمراہ کن نظریات پھیلائے جا رہے ہیں اور قرآن وسنت کے احکام کو جس طرح وقتی اور ہنگامی ثابت کیا جا رہا ہے، اُسے کوئی صاحبِ ایمان ٹھنڈے پیٹوں گوارا نہیں کر سکتا۔ اس ملک میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ان اصولوں کی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مصلح کی حیثیت سے اپنے عہد کے مطابق اور اپنے ملکی حالات کے پیشِ نظر کچھ اصولوں سے لوگوں کو آشنا کیا لیکن اب یہ اس بیسویں صدی میں کسی اہمیت کے حامل نہیں۔ ان میں سے بعض نے تو یہاں تک کہنے کی جسارت کی کہ آخر یہ کس قدر حماقت ہے کہ جو اصول ایک نیم وحشی معاشرے کے لیے وضع کیے گئے تھے اُن سے آج کی مہذّب سوسائٹی کو ہدایت اور رہنمائی لینے کی تلقین کی جا رہی ہے۔

جو لوگ اس معاملے میں ذرا محتاط ہیں وہ اسی بات کو ایک دوسرے انداز سے پیش کرتے ہیں۔ اُن کا قرآنِ حکیم کے بارے میں یہ موقف ہے کہ اس میں دو قسم کی تعلیمات پائی جاتی ہیں، ایک ابدی اور دوسری وقتی۔ پھر ابدی تعلیمات کے متعلق ان کا خیال یہ ہے کہ یہ صرف تین چار بنیادی حقائق کا مجموعہ ہیں۔ مثلاً توحیدِ باری تعالیٰ، احترامِ انسانیت۔ اور عقل کی فضیلت۔ ان اصولوں کے علاوہ قرآنِ مجید میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُس کی حیثیت وقتی ہے۔ قرآن کے یہ اصول اور ضابطے اُس وقت کے عرب معاشرے کے لیے تو بڑے مفید اور کارآمد تھے لیکن اب یہ بیکار کی زنجیریں ہیں۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت قرآن کے قوانین کو ناقابلِ عمل ٹھیرایا جاتا ہے۔

حدیث کے معاملے میں بھی ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنے عہد میں جو کچھ ارشاد فرمایا یا کیا، وہ صرف اُس وقت کی ایک ضرورت تھی۔ اس ضرورت کے پورا ہو جانے کے بعد اُس کی حیثیت محض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک تاریخی ریکارڈ کی سی رہ جاتی ہے جس پر مختلف زاویوں سے تحقیق کی جا سکتی ہے لیکن دنیائے عمل میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ امتِ مسلمہ کو اب اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر وقت کے تقاضوں کے مطابق کرنی چاہیے اور اس "قصۂ پارینہ" کو درمیان میں لا کر اپنی ترقی کی رفتار میں رکاوٹ نہ ڈالنی چاہیے۔

یہ ہیں قرآن و سنت کے بارے میں وہ خیالات جو الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ تجدد پسند حلقوں کی طرف سے پیہم پیش کیے جا رہے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب کسی اخبار یا رسالے میں یا کسی تقریب میں اس قسم کے باطل تصورات کا اظہار نہ کیا جاتا ہو۔ ایک طبقے کی طرف سے ملک میں یہ ہنگامہ برپا ہے کہ دین کو وقت کے مطابق ڈھالو اور اس کے اصولوں میں ضروریاتِ وقت کے مطابق تغیر و تبدل پیدا کرو۔

ملک کے موجودہ حالات میں یہ باور کرنا مشکل ہے کہ صدرِ مملکت کے کان ان ہنگاموں اور شورشوں سے ناآشنا ہوں گے۔ بلکہ بعض اوقات اُن کی اپنی زبان سے ایسی باتیں سُنی گئی ہیں جن سے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ خود بھی ان افکار سے متاثر ہیں۔ لیکن اب انہوں نے جو بیان دیا ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات ہی کو حق کا واحد سرچشمہ سمجھتے ہیں اور ان میں کسی تبدیلی کے قائل نہیں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر یہاں بھی ذہن میں یہ الجھن رہ جاتی ہے کہ جب اُن کا موقف یہ ہے تو پھر ایسے لوگوں کی حکومت کے ایوانوں میں کیوں پذیرائی ہو رہی ہے جو کتاب و سنت کی تعلیمات کو وقتی اور ہنگامی چیزیں کہہ کر انہیں بے وزن بنانے کی مذموم کوششیں کر رہے ہیں۔ صدرِ مملکت جیسے دانا آدمی کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ انسان کے بنائے ہوئے قانون اور خدا کے دیئے ہوئے قانون کے درمیان فرق یہی ہے کہ انسانی قانون چونکہ محدود علم اور محدود بصیرت رکھنے والے فرد یا افراد کا بنایا ہوا ہوتا ہے اس لیے وہ ایک وقتی ضرورت کو پورا کرتا ہے لیکن جو قانون انسانیت کو علیم و خبیر سمیع و بصیر ہستی عطا کرتی ہے وہ ابدی ہوتا ہے اور اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ قرآن حکیم خداوند تعالیٰ کی وہ آخری کتاب ہے جو قیامت تک انسانوں کے لیے اپنے اندر ہدایت کا پورا سامان رکھتی ہے اور حضور سرورِ کائنات کا اسوۂ حسنہ وہ آخری اسوہ ہے جس کی اتباع پوری انسانیت کے لیے نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ جو شخص یا گروہ ہدایت و رہنمائی کے ان دو سرچشموں کو وقتی اور ہنگامی کہتا ہے وہ درحقیقت یا تو قرآن کے منزل من اللہ اور رسول کے رسولِ خدا ہونے کا منکر ہے یا خدا کے بارے میں نہایت غلط قسم

© rasailojaraid.com

کے تصورات رکھتا ہے۔ وہ خدا کو بھی انسانوں پر قیاس کرکے یہ سمجھتا ہے کہ خدا کا علم اور اس کی بصیرت بھی محدود ہے اس لیے وہ انسان کو ایسے قوانین دیتا ہے جن کی افادیت عارضی ہے اور وقت کے گزرنے کے بعد وہ بیکار ہو جاتے ہیں۔ خدا اور اُس کے رسول کی تعلیمات کو وقتی اور ہنگامی کہنا درحقیقت خدا کے علیم و بصیر ہونے کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔ کوئی صاحبِ ایمان ان باطل اوہام کو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتا مگر ہمارے ملک میں چند بد باطن لوگ آئے دن اس قسم کے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں اور حکومت ان پر کوئی گرفت نہیں کرتی۔ بلکہ بعض حالات میں ان کی حوصلہ افزائی کرتی نظر آتی ہے۔ اس کی تازہ مثال ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب کے بارے میں اس کا فیاضانہ طرزِ عمل ہے۔

ڈاکٹر صاحب کوئی ایسی غیر معروف شخصیت نہیں کہ صدرِ مملکت اور اعیانِ حکومت کو اُن کے خیالات کا پتہ نہ ہو۔ انہیں مرکزی حکومت میں بھاری مشاہرے پر شعبۂ تحقیقاتِ اسلامی کی زمام کار اُن کی استعداد اور قابلیت کی بنا پر ہی سونپی گئی ہو گی۔ ظاہر بات ہے کہ انتخاب کے وقت اُن کی ڈگریاں اور سابقہ تجربے کے ساتھ ان کی تصنیفات اور مقالات بھی سامنے آئے ہونگے۔ انہیں دیکھنے سے اُن کے خیالات کا با آسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ لیکن معلوم نہیں کہ انہیں یہ اہم اور نازک ذمہ داری سونپتے ہوئے یہ معقول راستہ کیوں ترک کر دیا گیا۔ وزراء، سفراء کا تقرر تو خیر بڑی بات ہے، معمولی معمولی عہدیداروں کو منتخب کرنے وقت ان کے ماضی کی جانچ پڑتال، اُن کے فکری رجحانات، حکومت کے بارے میں اُن کے میلانات کی اگر چھان بین ضروری خیال کی جاتی ہے تو تحقیقاتِ اسلامی کے ناظم کا انتخاب کرنے کے لیے یہ چھان بین کہیں زیادہ ضروری تھی۔ ایک صاحبِ ایمان کے لیے اسلام، اُس کی جان و مال، عزت و آبرو، شہرت و اقتدار سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں اس انتخاب کے وقت ایمان کے اس بنیادی تقاضے کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے اس ادارے کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد وہ روش اختیار نہ کی جس کا ایمان متقاضی تھا بلکہ انہوں نے اسلام کے اساسی تصورات سے لے کر اُس کی معمولی سے معمولی جزئیات تک کے بارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نہایت غلط افکار کی نشر و اشاعت شروع کی۔ ملک کے اصحاب علم نے ان پر سخت گرفت بھی کی اور ان کی غلطیوں کو دلائل سے واضح کیا لیکن حکومت نے کسی کی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور ڈاکٹر صاحب اپنی ڈگر پر چلتے رہے۔ ہمیں یہاں یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ اقتدار سے اگر کوئی ذرہ برابر اختلاف بھی کرے تو اُس کے وجود کو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کیا جاتا اور اسے بیک بینی دو گوش نکال دیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں کسی مروت، کسی سابقہ تعلق کی پرواہ بھی نہیں کی جاتی مگر اسلام کے بارے میں ہمارے حکمران طبقہ کی حس اور غیرت بہت کم بیدار ہوتی ہے۔ یہاں اقتدار کے سایۂ عاطفت میں رہ کر جو کوئی اسلام کے خلاف جو سازش چاہے کرتا رہے، کوئی اسے پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ صدر مملکت اور ان کی حکومت کے خلاف ذرا ذرا سے اختلافات اور ہلکی سے ہلکی تنقید پر رسالے اور کتابیں ضبط ہوئی ہیں اور معاملہ زبان بندیوں، نظربندیوں اور ضبط املاک تک پہنچا ہے۔ لیکن اسلام کے خلاف ہنگامے اٹھانے والوں پر قطعاً کوئی گرفت نہیں کی جاتی۔ کیا یہ صورتِ حال اس حقیقت کی غمازی نہیں کرتی کہ صدر مملکت اور ان کے رفقائے کار کی نظر میں اسلام اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا ان کا اقتدار۔ جس اسلام کی محبت کے وہ دعویدار ہیں اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ اسلام کے مقابلے میں کسی چیز کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ کیونکہ جان و مال، عزت و اقتدار تو عارضی چیزیں ہیں، اور ان کے مقابلے میں ایمان ابدی فلاح و سعادت کا سرچشمہ ہے۔ اس بنیادی حقیقت کا صدرِ مملکت نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ انہوں نے اچانک نہیں اپنائے۔ وہ کئی سال تک مسلسل اسلام کے مسلمہ اصولوں کے خلاف شکوک و شبہات پیدا کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے حدیث کے خلاف بڑے گمراہ کن نظریات پیش کیے اور اس کے بارے میں ایک ایسا موقف اختیار کرنے کی تلقین کی کہ اگر اُسے قبول کر لیا جائے تو دین میں اس کی حجیت یکسر ختم ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اسلامی سزاؤں، حدودِ شرعی، حرام و حلال کے معیارات، سود اور شراب اور ذبیحہ کے بارے میں نہایت غلط باتیں کہیں مگر حکومت نے ان کی ان کارگزاریوں کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے انہیں بھاری معاوضہ دیا جاتا رہا اور انہیں یہ آسانیاں پہنچائی گئیں کہ وہ سرکاری اخراجات پر ان مذموم افکار کی اشاعت کریں۔ اب جبکہ انہوں نے اپنے سارے افکار کو سمیٹ کر پوری وضاحت کے ساتھ ایک کتاب میں بیان کیا اور عوام کے سامنے یہ بات کھل کر آئی کہ شعبۂ تحقیقات اسلامی کے ناظم اسلامی معتقدات کا کیا حلیہ بگاڑ رہے ہیں تو عوام میں بالکل فطری طور پر اضطراب پیدا ہوا۔ مگر حکومت نے انہیں کچھ کہنے کے بجائے نہایت سطحی قسم کے دلائل کے ساتھ مدافعت شروع کی کبھی یہ کہا جاتا کہ یہ کتاب انہوں نے ۱۹۵۷ء میں لکھی تھی جب کہ وہ اس ادارہ سے وابستہ نہ تھے لیکن کتاب پر جہاں ان کا نام بحیثیت مصنف درج ہے وہاں ناظم ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی لکھا ہوا ہے۔ پھر ایک وزیر باتدبیر نے تو ان کے لیے ایک پریس کانفرنس بلوائی اور اس کے بعد انہوں نے یہ ارشاد فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے حق میں جو صفائی پیش کی ہے وہ اس سے بالکل مطمئن ہو گئے ہیں اور اب اُن کے ذہن میں کوئی خلش باقی نہیں رہی۔ وزیر صاحب کی یہ روش بھی ناقابلِ فہم تھی۔ جب حکومت یہ موقف اختیار کرتی ہے کہ اس کتاب کا سرکاری پالیسی سے کوئی تعلق نہیں تو پھر انہیں ڈاکٹر صاحب کی صفائی کے لیے اتنی سرگرمی دکھانے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ اس سے تو یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور انہوں نے اس میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے حکومت انہیں کسی طرح بھی تشویش کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ ہمارا یہ احساس کسی بدگمانی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے کچھ ٹھوس وجوہ ہیں اور ان میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں جو اساسی تصور پیش کیا ہے وہ وہی ہے جس کے مطابق برسرِ اقتدار طبقے کی بعض نہایت اونچی شخصیتیں اظہار خیال کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے خیالات پر گذشتہ ترجمان القرآن میں بحث کی جا چکی ہے یہاں ہم بڑے اختصار کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ موصوف کا اصل مدعا کیا ہے۔ اُن کا حقیقی مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلام کے آئین و ضوابط کی حیثیت مستقل اور پائیدار اقدار کی نہیں بلکہ محض ہنگامی اور عارضی ہے۔ اور ان میں حالات کے مطابق تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ان خیالات کے بارے میں جو توضیحی بیانات دیئے ہیں اُن میں بڑی ہوشیاری سے کام لیا گیا ہے۔ وہ جن باتوں کو مستقل اور پائیدار تسلیم کرتے ہیں وہ قرآن مجید کے چند معتقدات ہیں یا اسلامی قوانین کی مجرد روح ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باقی جہاں تک قوانین اور ضابطوں کا تعلق ہے وہ اب بھی اُن کے بارے میں وہی موقف رکھتے ہیں جو انہوں نے اپنی تصنیف میں اختیار کیا ہے۔ ان ضوابط کو عارضی ثابت کرنے کے لیے انہوں نے یہ فلسفہ گھڑا ہے کہ قرآن حضورؐ کے ایسے گہرے غور و فکر کا نتیجہ تھا جب اُن کی فکر کائنات کے اخلاقی اصول سے ہم آہنگ ہو جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مستقل اور پائیدار چیز کائنات کا اخلاقی اصول ہے جو خود قوانینِ فطرت سے ماخوذ ہے۔ یہ وہ نقطہ ہے جہاں سے نظامِ شریعت حق و باطل کا معیار قرار پانے کے بجائے قانونِ قدرت معیار قرار پاتا ہے۔ قوانینِ قدرت کو رہنما بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اصل اہمیت وحی کے بجائے تجربے، مشاہدے اور عقل کو حاصل ہو اور ان کی روشنی میں اقدارِ حیات اور نظامِ زندگی کو وقت کے مطابق تبدیل کیا جا سکے۔ یہ وہ بنیادی تصور ہے جو اس پوری کتاب میں اوّل سے لے کر آخر تک کار فرما ہے۔

اس تصور کے مقابلے میں اسلام یہ عقیدہ پیش کرتا ہے کہ حق و باطل کا معیار تجربہ، مشاہدہ اور عقل نہیں بلکہ وحی ہے، کیونکہ علم کے یہ تینوں ماخذ اپنے بل بوتے پر انسانی زندگی کے لیے کوئی متوازن نظام تشکیل نہیں دے سکتے۔ انسان کی صحیح رہنمائی کے لیے وحی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ عقل اور تجربے سے جہاں تک ہو سکے استفادہ تو کیا جائے مگر ان سے جو نتائج اخذ کیے جائیں ان کی صحت کو وحی کی روشنی میں پرکھ لیا جائے کیونکہ وحی ہی انسانی ہدایت کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو نہ صرف ہر خطا سے پاک ہے، بلکہ مستقل قدر و قیمت کا حامل ہونے کی وجہ سے ہر عہد اور دور میں واجب الاتباع بھی ہے۔

حکومت جس طرح دینی افکار اور نظریات کے بارے میں بے حس ہے، اس سے کہیں زیادہ دینی اقدار اور دینی روایات سے بے تعلق نظر آتی ہے۔ اسلام کا ایک سچا خادم ہونے کی وجہ سے صدرِ مملکت پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُن بھلائیوں کو فروغ دیں جنہیں اسلام فروغ دینا چاہتا ہے اور اُن برائیوں کو مٹانے کی فکر کریں جنہیں اسلام مٹانا چاہتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں بھی صورتِ حال کسی اعتبار سے بھی قابلِ اطمینان نہیں بلکہ بعض معاملات میں تو بڑی تشویشناک نظر آتی ہے۔ ایک مسلم حکومت اور اس کے مسلمان سربراہ پر خدا کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار اور اختیار کو نیکی

© rasailojaraid.com

اور بھلائی کی ترویج اور برائی کے استیصال کے لیے استعمال کرے۔ اس حقیقت کی قرآن مجید نے یوں وضاحت کی ہے :

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ (الحج - ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔

یہ آیت مسلمان حکمران کی ذمہ داریوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ کسی مسلمان حکومت کا صرف یہی کام نہیں کہ وہ ملک کو بیرونی خطروں سے بچائے اور داخلی شورشوں سے محفوظ رکھے بلکہ دین کے معاملے میں بھی اُس پر ایک ایسی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو دوسری ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ مثبت طور پر اس کا فرض یہ ہے کہ وہ ملک کے اندر نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرے اور یہ دیکھے کہ مسلم سوسائٹی میں نیکی اور بھلائی برابر پروان چڑھ رہی ہے یا نہیں۔ اگر حکومت اس بنیادی فرض کے بجا لانے میں غفلت سے کام لے رہی ہے تو اس کی باقی منصوبہ بندیاں اور کارگزاریاں ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

پھر اس کے ساتھ ساتھ مسلم حکومت کے فرائض میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ اُن ساری برائیوں کے تدارک کا التزام کرے جنہیں اسلام ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جن کا وجود دینی نقطۂ نظر سے مضرت رساں ہے۔

صدرِ مملکت جیسے محبِ اسلام اور محبِ رسول کے بارے میں یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ وہ ایک سربراہ کی حیثیت سے اپنی دینی ذمہ داریوں سے ناآشنا ہوں گے۔ انہوں نے اپنی کتاب "دوست نہ کہ آقا" میں اسلامی نظامِ حیات، اور اسلامی قانون کے بارے میں مختلف مقامات پر جو مباحث اٹھائے ہیں ان کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان مسائل پر بحیثیت مسلمان خوب غور کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس غور و فکر میں ایک مسلمان سربراہ مملکت کی دینی اور اخلاقی ذمہ داریاں بھی یقیناً اُن کے سامنے آئی ہوں گی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ان کے بارے میں بھی انہوں نے ضرور غور و خوض کیا ہوگا۔ لیکن ہمیں یہاں بھی بڑے دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا غور و خوض کسی ٹھوس نتیجے کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں آیا۔ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرنے والا اور قرآن حکیم اور اسوۂ رسولؐ کو سرچشمۂ ہدایت ماننے والا سربراہ آخر دین کے معاملے میں وہ غیر جانبدارانہ طرزِ عمل کیونکر اختیار کر سکتا ہے جو ایک لادینی ریاست کا طغرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ لادینی ریاستیں بھی مذہب کے بارے میں کبھی غیر جانبدار نہیں رہیں بلکہ وہ اس میدان میں ایک خاص طرزِ عمل اختیار کرتی ہیں جس سے کسی مذہب کو تقویت اور کسی کو نقصان پہنچتا ہے۔ جب لادینی ریاستوں اور ان کے بے دین سربراہوں کا یہ حال ہے تو اسلامی جمہوریہ اور اُس کے مُحبّ اسلام سربراہ کو تو دین کی سربلندی اور غیر اسلامی رجحانات اور روایات کے قلع قمع کرنے میں بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ لیکن اس باب میں یہاں عملاً جو کچھ ہو رہا ہے وہ بڑا مایوس کن ہے۔ بعض جلسوں اور تقریبات میں صدرِ مملکت اور ان کے رفقائے کار کی زبانوں سے اسلام کی مدح و توصیف میں کبھی کبھی چند رسمی کلمات تو ضرور سن لیے جاتے ہیں لیکن اس اسلام کے نفاذ کے لیے قطعاً کسی قسم کی کوئی تحریک نہیں ہوتی۔ آئے دن مختلف محکموں اور اُن کے ناظمین کو مختلف ہدایات جاری ہوتی رہتی ہیں لیکن ان میں کبھی ایک مرتبہ بھولے سے بھی اس بات کا ذکر تک نہیں آیا کہ انہیں نماز کی پابندی، شعائرِ اسلام کا احترام اور منکرات سے اجتناب کرنا چاہیے ورنہ اُن کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دفاتر میں بے دین عناصر نہ صرف کھلم کھلا احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے ہیں بلکہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور کوئی انہیں ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ اور آخر ٹوکے بھی کون؟ کیونکہ جو لوگ انہیں ٹوکنے کی پوزیشن میں ہیں وہ تو خود فکر و عمل کے اعتبار سے اس بے دین گروہ کے ہم مسلک و ہم مشرب ہوتے ہیں اور ان کی شہ پر تو یہ گروہ اس قسم کی بیہودگیاں کرنے کی جسارت کرتا ہے۔

معاملہ پھر اس پر ختم نہیں ہوتا کہ اس ملک میں اسلام کی پیش کردہ بھلائیوں کو پھیلانے اور منکرات کو مٹانے کی کوئی فکر نہیں کی جا رہی بلکہ یہاں حکومت نے جو طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے اُسے دیکھتے ہوئے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت بُرائیوں کو پھیلایا جا رہا ہے۔ (باقی صـ۶۲ پر)

© rasailojaraid.com